غم اور خوف سے نجات

قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ایک تجزیاتی مطالعہ

ـــــ ڈاکٹر احمد افضال ـــــ

(گذشتہ سے پیوستہ)

تیسرا سبق:

دنیا میں انسان کو جو مصیبت پیش آتی ہے یا نعمت ملتی ہے وہ بالعموم زندگی کے بڑے امتحان ہی کا حصہ ہوتی ہے۔ مصیبت آنے پر سمجھنا کہ یہ کسی گناہ کی سزا ہے یا نعمت ملنے پر گمان کر لینا کہ یہ خدا کے خوش اور راضی ہونے کا ثبوت ہے ------ دونوں قسم کے خیالات غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ جس طرح کسی تعلیمی امتحان کے نتیجے کا اعلان اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ امتحان مکمل نہ ہو جائے' اسی طرح حیات دنیا کے دوران ہی جزا و سزا کامل جانا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اچھے برے حالات جزا و سزا کے آخری فیصلوں کی بنیاد پر نہیں' بلکہ آزمائش کے طور پر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

"ہر جاندار کو موت کا مزا چکھنا ہے' اور ہم اچھے اور برے حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمائش کر رہے ہیں۔ آخر کار تمہیں ہماری ہی طرف پلٹنا ہے"۔ (الانبیاء:۳۵)

اس سے معلوم ہوا کہ جسے ہم آفت' بیماری' معذوری' اور افلاس کہتے ہیں وہ درحقیقت ایک پرچۂ امتحان ہے' اور جسے ہم دولت' صحت' آسائش اور اقتدار کا نام دیتے ہیں وہ ایک دوسرا پرچۂ امتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ مختلف طریقوں سے آزما کر دیکھتا ہے کہ کون اس کے راستے پر ثابت قدم رہتے ہیں اور کون حالات کے نشیب و فراز سے متاثر ہو کر بھٹک جاتے ہیں۔

قرآن حکیم بار بار کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصائب و تکالیف کے ذریعے اپنے بندوں کو آزماتا ہے تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ ایمان کی دولت فی الواقع کس کو حاصل ہے اور کون اس کے جھوٹے دعویدار ہیں:

"اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر' فاقہ کشی' جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے"۔ (البقرۃ:۱۵۵)

"کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے' اور انہیں آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون"۔ (العنکبوت:۲'۳)

چنانچہ ایمانِ حقیقی سے محروم لوگ مشکلات میں بہت جلد ہمت ہار بیٹھتے ہیں' ہر اس ہستی کے سامنے سر جھکا لیتے ہیں جو بظاہر بااختیار نظر آئے اور ہر گناہ کا کام کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کبھی قسمت یا گردشِ ایام کو کوسنے لگتے ہیں اور کبھی خدا کو۔ یہاں تک کہ مایوس ہو کر خودکشی جیسا انتہائی قدم اٹھا لیتے ہیں۔ جبکہ ایسے حالات میں ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان حلال و حرام کی حدود کا خیال رکھتے ہوئے مشکلات کا مقابلہ کرے' راہ حق پر قائم رہے' اور جس نقصان کی تلافی ممکن نہ ہو اسے صبر کے ساتھ برداشت کرے۔

مصائب و مشکلات کی طرح کسی کو دولت و نعمت اور بے فکری کا ملنا بھی آزمائش ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

"تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو ایک آزمائش ہیں"۔ (التغابن:۱۵)

"واقعہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ سروسامان بھی زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے"۔ (الکہف:۷)

دنیا کا مال و اسباب' اولاد' نام و نمود' اثر و رسوخ' اور شان و شوکت عطا کر کے اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتا ہے کہ بندہ صراط مستقیم پر رہتا ہے یا نہیں۔ اکثر لوگ روپیہ' طاقت' شہرت' اور عزت پا کر سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے عیش و عشرت کے لئے فراہم کیا گیا ہے' اور بھول جاتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے آزمائش ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ حالات کے نشیب و فراز کے ساتھ ان کا مزاج اور رویہ بھی بدلتا رہتا ہے۔

"انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اس کو نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ اینٹھتا ہے اور پیٹھ موڑ لیتا ہے اور جب ذرا مصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو مایوس ہونے لگتا ہے"۔ (بنی اسرائیل:۸۳)

اس کے برعکس جو لوگ دنیا کے رنج اور خوشی کی حقیقت پالیتے ہیں ان کے لئے یہ چیزیں مایوسی یا تکبر کے بجائے ترقی ایمان اور تزکیۂ نفس کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ "مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اللہ اس کے حق میں جو فیصلہ بھی کرتا ہے وہ اس کے لئے اچھا ہی ہوتا ہے۔ مصیبت پڑے تو صبر کرتا ہے اور وہ اس کے لئے اچھا ہوتا ہے۔ خوشحالی میسر آئے تو شکر کرتا ہے اور وہ بھی اس کے لئے اچھا ہی ہوتا ہے۔ یہ بات مومن کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوتی"۔ (بخاری و مسلم)

اکثر لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر مال و دولت اور جاہ و اقتدار کے ملنے یا نہ ملنے کو عزت و ذلت کا معیار بنا لیتے ہیں۔ جس شخص کا معیارِ زندگی اونچا ہو اسے "بڑا" آدمی کہہ دیتے ہیں خواہ اس کے اعمال کتنے ہی گھناؤنے ہوں۔ اور جس کا معیار زندگی پست ہو اسے "چھوٹا" سمجھ لیتے ہیں خواہ اس کے اعمال کتنے ہی صالح ہوں۔ حالانکہ اصل معیار یہ نہیں بلکہ تقویٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> "انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اسے اکرام و انعام دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا' اور جب اس کو (دوسری طرح) آزماتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔ ہرگز ایسا نہیں ہے....."۔ (الفجر:۱۵-۱۷)

سب جانتے ہیں کہ دنیا کی تنگ دستی اور افلاس کا نیک اور شریف لوگوں کو بھی سامنا کرنا پڑتا ہے اور اللہ کے فضل اور نعمتوں سے برے لوگ بھی نوازے جاتے ہیں۔ دراصل رزق کی تقسیم حکمتِ الٰہی کے تحت اور آزمائش کی مصلحت کے ساتھ ہوتی ہے نہ کہ انعام و غضب کے لئے۔

> "ان سے کہو! میرا رب جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ناپ تول کر عطا کرتا ہے۔ مگر اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے"۔ (سبا:۳۶)

اللہ تعالیٰ یوں تو سب کو عطا کرتا ہے' تاہم اس کی دین سب کے لئے یکساں اور برابر نہیں ہے۔ دنیا میں مال و دولت یا صلاحیتیں ہر شخص کو حسب تقدیر ملتی ہیں۔ اللہ نے کسی کو ایک چیز کم دی ہے تو کوئی دوسری شے زیادہ دے دی ہے۔ کسی اور کو پہلی چیز زیادہ بخش دی ہے تو دوسری شے کم عطا کی ہے۔ اسی طرح دنیا کی روزی نیک و بد دونوں طرح کے انسانوں کو ملتی ہے۔ جو شخص

محض دنیا کی کامیابی کو اپنا مقصود بنالیتا ہے وہ چاہے جتنی کوشش کرلے' اسے وہ سب نہیں مل سکتا جس کی وہ تمنا کرتا ہے۔ ملے گا اسی قدر جتنا اللہ چاہے گا۔ دوسری طرف جو شخص آخرت کی فلاح کو اپنا اصل ہدف بناتا ہے اور اسی مقصد کے لئے اپنی زیادہ کوششیں صرف کرتا ہے' تو دنیا کا رزق اسے بھی اتنا ہی ملے گا جس قدر اللہ چاہے گا۔ فرق یہ ہے کہ پہلے شخص کے لئے آخرت کی بھلائیوں میں کوئی حصہ نہیں' جبکہ دوسرے شخص کو اللہ کی رضا اور ہمیشہ باقی رہنے والا عیش حاصل ہو گا۔

"اور جو کوئی دنیا کا خواہشمند ہو' اسے ہم یہیں دے دیتے ہیں جو کچھ جسے دینا چاہیں' پھر اس کے مقسوم میں جہنم لکھ دیتے ہیں جسے وہ تاپے گا ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر۔ اور جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اس کے لئے سعی کرے جیسی کہ اس کے لئے سعی کرنی چاہئے' اور ہو وہ مومن' ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہو گی۔ ان کو بھی اور ان کو بھی' دونوں فریقوں کو ہم دنیا کا سامانِ زیست دیئے جا رہے ہیں۔ یہ تیرے رب کا عطیہ ہے اور تیرے رب کی عطا کو روکنے والا کوئی نہیں"۔
(بنی اسرائیل: ۱۷۔۲۰)

"اور جو لوگ بس اسی دنیا کی زندگی اور اس کی خوشنمائی کے طالب ہوتے ہیں ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں' اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی' مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لئے آگ کے سوا کچھ نہیں"۔ (ھود: ۱۵'۱۶)

رزق حلال خواہ تھوڑا ہی ہو اس کثیر مال و دولت سے بہرحال بہتر ہوتا ہے جو ناجائز طریقے سے حاصل کیا جائے یا جو کفر و طغیان کا باعث بن جائے۔ فرمان الٰہی ہے:

"اور نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو دنیوی زندگی کی اس شان و شوکت کو جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے۔ وہ تو ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالنے کے لئے دی ہے اور تیرے رب کا دیا ہوا رزق ہی بہتر اور پائندہ تر ہے"۔ (طٰہٰ: ۱۳۱)

"کہہ دو کہ پاک اور ناپاک یکساں نہیں ہیں خواہ ناپاک کی بہتات تمہیں کتنا ہی فریفتہ کرنے والی ہو"۔ (المائدہ: ۱۰۰)

دنیاوی جزا و سزا کی حقیقت: قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی طرف کسی رسول کو مبعوث فرما دیتا ہے تو اس قوم کے حق میں اس کا ایک خاص قانون نافذ ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر وہ فرمانبرداری اور شریعت کی پیروی کا راستہ اختیار کریں تو انہیں دنیا ہی میں خوشحالی اور اقتدار عطا ہوتا ہے اور اگر وہ نافرمانی اور بغاوت کریں تو انہیں دنیا میں ہی عذاب دیا جاتا ہے[1]۔ چنانچہ عاد اور ثمود' قوم نوحؑ' قوم لوطؑ' قوم شعیبؑ اور آل فرعون اسی قانون کے تحت تباہ و برباد کئے گئے۔ اسی طرح بنی اسرائیل اور امت مسلمہ پر' مختلف اوقات میں ان کے مجموعی رویّے کی بنیاد پر' خوشحالی بھی آئی اور رسوائی و مغلوبیت بھی مسلط کی گئی۔ لیکن یاد رہے کہ یہ معاملہ صرف اقوام کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ افراد کے لئے اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ نیکی کرنے سے دل کا سکون اور مزید نیکی کی توفیق عطا ہوتی ہے[2]' اور بدی کرنے پر دل کی تنگی و بے چینی کے ساتھ گناہ کا راستہ آسان کر دیا جاتا ہے[3]۔ اگر دنیا میں انفرادی مکافات عمل ہے بھی تو نہایت ناقص صورت میں۔ رہی نیکی و بدی کی اصل اور بھرپور جزا و سزا تو اس کے لئے عالم آخرت ہے نہ کہ دنیا۔ یہاں کا حال تو ایسا ہے کہ اگر کسی نیک آدمی کو نعمت ملتی ہے تو اس میں انعام کے بجائے آزمائش کا پہلو غالب رہتا ہے۔ اور اگر کسی برے آدمی پر مصیبت آتی ہے تو اس میں سزا کے بجائے تنبیہہ کا مقصد پیش نظر ہوتا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ گناہ گار شخص پر مشکل اور تکلیف کا آنا اللہ کی رحمت ہے کہ وہ اسے سنبھلنے اور توبہ کرنے کا موقع دے رہا ہے[4]۔

۱۔ اس مضمون کی آیات قرآن میں کئی جگہ وارد ہوئی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے: آل عمران ۱۳۹ و ۱۴۷' المائدہ ۶۶' الاعراف ۹۶' یونس ۶۳ و ۶۴' ہود ۳ و ۵۲' ابراہیم ۷' النحل ۳۰' النور ۵۵' الزمر ۱۰' النوح ۱۰ تا ۱۲۔

۲۔ النحل: ۹۷

۳۔ طٰہٰ: ۱۲۴

۴۔ قرآن حکیم کی بعض آیات سے بظاہر ایسا تاثر ملتا ہے کہ مصائب کا سبب گناہ ہیں۔ مثلاً شوریٰ ۳۰ و ۴۸ اور الروم ۳۶۔ لیکن ان آیات میں دراصل اس بات کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

چوتھا سبق:

اگرچہ مصیبت کا آنا یا کسی نعمت کا عطا ہونا' دونوں ہی امتحان کے طریقے ہیں' تاہم یہ ہرگز برابر نہیں۔ آزمائش دراصل اس امر کی ہوتی ہے کہ ہم مصیبت میں اللہ کے بندوں سے امیدیں وابستہ کر بیٹھتے ہیں یا اللہ ہی کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ اسی طرح نعمت ملنے پر اللہ کے شکر گزار بن کر رہتے ہیں یا کسی گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

پہلی صورت یعنی "مصیبت" کے بارے میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے دو درجے ہیں۔ معمولی قسم کی مصیبت میں انسان سے کسی نہ کسی نوعیت کے شرک کا ارتکاب ہو سکتا ہے۔ مثلاً وہ کسی حاکم یا افسر کو' کسی دیوی یا دیوتا کو' اور کسی فرشتے یا فوت شدہ بزرگ کو اپنے لئے خیر و شر کا مختار سمجھ لیتا ہے۔ لیکن جب اس سے شدید تر مصیبت آتی ہے تو ان جھوٹے خداؤں کا سہارا بھی باقی نہیں رہتا اور انسان سمجھ لیتا ہے کہ اللہ کے سوا دوسرے بے اختیار ہیں اور فی الواقع مصیبت کو ٹالنے کی طاقت اللہ کے سوا کسی میں نہیں ہے۔ اس اعتبار سے مصائب و شدائد کا آنا آزمائش کی ایک آسان شکل ہے کیونکہ اس میں اللہ کو بھول جانے کا امکان کم ہوتا ہے۔

"انسان پر جب کوئی آفت آتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتا ہے۔" (الزمر: ۸)

یہ اور بات ہے کہ برے وقت کے جاتے ہی بہت سے لوگ دوبارہ اللہ سے غافل ہو جاتے ہیں:

"پھر جب اس کا رب اسے اپنی نعمت سے نواز دیتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس پر پہلے پکار رہا تھا اور دوسروں کو اللہ کا ہمسر ٹھہراتا ہے تاکہ اس کی راہ سے گمراہ کرے"۔ (الزمر: ۸)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

جب کسی رسول کو بھیجتا ہے تو اس کی قوم پر کچھ اجتماعی نوعیت کی مشکلات اور آفات بھی نازل کرتا ہے (جیسے مکہ کا قحط) تاکہ لوگ خواب غفلت سے جاگیں اور خدا کی طرف متوجہ ہوں۔ اس مضمون کی وضاحت کے لئے ملاحظہ کیجئے الانعام ۴۲ تا ۴۴' الاعراف ۹۶ تا ۹۹' یونس ۲۱' النحل ۱۱۲ و ۱۱۳' السجدہ ۲۱' الدخان ۱۰ تا ۱۶' الروم ۴۱

رہی دوسری صورت یعنی "نعمت" کا عطا ہونا تو درحقیقت یہ زیادہ مشکل اور کڑا امتحان ہے۔ لوگ اپنی جہالت و نادانی میں یہ گمان کر لیتے ہیں کہ ہمیں جو کچھ ملا ہے ہماری اپنی کوشش' تدبیر' صلاحیت' قابلیت' اور منصوبہ بندی سے ملا ہے۔ جب کسی کا کام خوب چلنے لگتا ہے تو اسے یاد نہیں رہتا کہ یہ سب اللہ کا فضل ہے اور کسی استحقاق کی وجہ سے نہیں بلکہ آزمائش کے لئے عطا ہوا ہے۔

"جب انسان کو ذرا سی مصیبت چھو جاتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے اور جب ہم اسے اپنی طرف سے نعمت دے کر اپھار دیتے ہیں تو کہتا ہے یہ تو مجھے علم کی بنا پر دیا گیا ہے! نہیں بلکہ یہ آزمائش ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔" (الزمر: ۴۹)

پانچواں سبق:

قرآن حکیم بار بار یاد دلاتا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کی ملکیت ہے۔ انسان کے پاس جو بھی ہے' خواہ ظاہری مال و اسباب ہوں یا باطنی صلاحیتیں اور قوتیں' یہ سب اس کا اپنا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے جو کچھ مدت کے لئے اس نے دے رکھی ہے۔ اگر وہ اپنی کسی عطا کی ہوئی شے کو واپس لینا چاہے تو اسے پورا پورا اختیار حاصل ہے۔ اگر یہ حقیقت پیش نظر رہے تو ہمیں کسی نقصان یا ناکامی پر افسوس اور مایوسی نہیں ہوگی۔ جب کوئی چیز سرے سے ہماری ملکیت ہے ہی نہیں' تو اس کے جاتے رہنے پر غم کیسا؟

"کہو' اے اللہ' ملک کے مالک' تو جسے چاہتا ہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے' جس کو چاہے غالب کر دیتا ہے اور جس کو چاہے پست کر دیتا ہے۔ بھلائی تیرے ہی اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔" (آل عمران:۲۶)

چھٹا سبق:

ارشاد الٰہی ہے:

"ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔" (النساء: ۱۹)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات خیر مطلق ہے۔ اس لئے وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اس میں بندوں کے لئے کوئی نہ کوئی بھلائی اور خیر ضرور پوشیدہ ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر صورتوں میں اللہ

تعالیٰ کی عظیم حکمتیں اور مصلحتیں ہماری ننھی سی عقلوں میں نہیں سماتیں اور ہم سمجھ ہی نہیں پاتے کہ کسی مصیبت میں کون سا خیر چھپا ہے۔ سورۂ کہف میں قصۂ موسیٰؑ و خضرؑ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کائنات میں شر کا وجود اضافی (RELATIVE) ہے۔ جو واقعہ ایک لحاظ سے ناگوار اور تکلیف دہ محسوس ہوتا ہے' اگر غیب کے پردے اٹھا دیئے جائیں تو اسی واقعے میں خیر کے پہلو بھی نظر آنے لگیں گے۔

جو مصائب ہم پر ہماری اپنی غلطی یا کوتاہی کے باعث آتے ہیں ان میں خیر کا نمایاں پہلو یہ ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی غلطیوں کا احساس ہو جاتا ہے' اور ہم مستقبل میں زیادہ صحیح روش اختیار کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ یہ حقیقت تسلیم کی جاتی ہے کہ ہم جتنی زیادہ غلطیاں کرتے ہیں اور جتنی زیادہ ناکامیوں سے دوچار ہوتے ہیں' اسی قدر ہمارے علم اور تجربے میں اضافہ ہوتا ہے اور اسی قدر ہماری ترقی اور پائیدار کامیابی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ صرف ناکامی ہماری استاد بنتی ہے اور ہمیں بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔ اس کے برعکس کامیابی سے ہم کچھ نہیں سیکھتے بلکہ ہماری غلط سوچیں ہی پختہ ہو جاتی ہیں۔

جو مصائب دوسرے لوگوں کے ہاتھوں یا قدرتی طور پر واقع ہوتے ہیں اور جن کے وارد ہونے میں ہمارا اپنا کوئی کردار نہیں ہوتا' ان میں بھی خیر کے پہلو موجود ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر غور کیجئے کہ اگر دنیا میں انسان کی زندگی پورے آرام و سکون سے گذرتی تو وہ یہ سمجھ بیٹھتا کہ مجھ سے بالاتر کوئی ہستی نہیں ہے۔ مشکلات اور شدائد ہمیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ ہماری تقدیر مکمل طور پر ہمارے اپنے ہاتھوں میں نہیں ہے بلکہ کوئی اور طاقتور ہستی اسے CONTROL کر رہی ہے۔

اسی طرح کا معاملہ اخلاقی شر کا ہے کہ دنیا میں معصیت اور جرم کے جو رجحانات پائے جاتے ہیں ان میں بھی خیر کسی نہ کسی شکل میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اولاً یہ کہ اگر زندگی میں رکاوٹیں اور موانع موجود نہ ہوں تو حیات جامد ہو کر رہ جائے۔ انسان کے کردار کی ترقی اسی وقت ہوتی ہے جب اسے مزاحم قوتوں سے لڑنا پڑتا ہے۔ انسان جب اپنے نفس کے ناجائز مطالبوں سے کشمکش کرتا ہے اور جب سماج کے باطل رجحانات سے جنگ کرتا ہے تو اسی مزاحمت سے وہ قوت جنم لیتی ہے جو اس کے ارتقاء کے لئے ضروری ہے۔ اگر نیکی کرنے میں فائدے

ہی فائدے ہوتے اور بدی کرنے میں نقصان کے سوا کچھ نہ ہوتا تو پوری نسلِ آدم صراط مستقیم ہی پر قائم رہتی اور یہ ظاہر ہی نہ ہو پاتا کہ کون نیک ہیں اور کون بد؟ دنیا کا نظام کچھ ایسا بنایا گیا ہے کہ یہاں خیر و شر میں مسلسل تصادم رہتا ہے اور اس طرح بدی کے داعیات کا مقابلہ کرنے سے انسانی نفس کا تزکیہ ہوتا رہتا ہے۔

ثانیاً اس امر کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک محدود دائرے کے اندر اختیار اور آزادیٔ انتخاب (FREEDOM OF CHOICE) عطا فرمائی ہے۔ یہ اختیار ایک دودھاری تلوار کی طرح ہے کہ اس سے خیر بھی برآمد ہو سکتا ہے اور شر بھی۔ چنانچہ علامہ اقبال اپنے خطبات میں لکھتے ہیں:

> "خیر کا مطلب ہے انسان کا برضا و رغبت کسی اخلاقی نصب العین کی پیروی کرنا..... وہ ہستی جس کے اعمال و افعال کُل کی طرح متعین ہیں' خیر کی اہل کیسے ہو سکتی ہے؟ آزادی خیر کی شرطِ اولین ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسے نفوسِ متناہیہ (FINITE EGOS) کی آفرینش جن کے سامنے عمل کا ایک نہیں' کئی راستے ہوں اور ہر راستے کی اپنی قدر و قیمت' ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔ کیونکہ ہم ان میں سے جس راستے کا چاہیں انتخاب کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر انسان خیر کا انتخاب کر سکتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ شر کا انتخاب کر لے.... انسان کی مخفی قوتوں کی تربیت کچھ یونہی ممکن تھی کہ اس طرح کا خطرہ برداشت کر لیا جاتا"۔ (تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ' ص ۱۲۸'۱۲۹)

دراصل گناہ اور نیکی دونوں لازم و ملزوم ہیں کیونکہ دونوں کا منبع انسان کا اختیار ہے۔ اگر انسان فرشتوں کی طرح بے اختیار مخلوق ہوتا تو دنیا میں برائی اور جرم کا کوئی وجود نہ ملتا' لیکن ایسی صورت میں خیر اور بھلائی بھی نہ ہوتی اور ہماری حیثیت اشرف المخلوقات کے بجائے فقط دو ٹانگوں پر چلنے والے جانور کی رہ جاتی۔ آزمائش کا تقاضا اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب انسان کو اپنا راستہ چننے کا اختیار حاصل ہو۔

(جاری ہے)